© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے قبرستان میں مرزائیوں کی تدفین پر روک

مجلس احرار کے نزدیک چوں کہ مرزائی غیر مسلم تھے، اس لیے ان کا ہر قسم کا مقاطعہ اہم اور ضروری تھا۔ قومی اور ملکی معاملات کے علاوہ موت وحیات کے سلسلے میں بھی احرار کا موقف تھا کہ کسی مرزائی کی لاش مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونی چاہیے۔ آخر ۱۹ رجولائی ۱۹۳۵ء کو امرتسر کے ایک قبرستان میں ایک مرزائی کو دفن کرنے پر ہنگامہ ہوا۔ پولیس نے اس موقع پر مداخلت کی۔ احرار رضا کاروں پر لاٹھیاں چارج ہوئیں اور ان کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ بال آخر اس مرزائی کی لاش ایک دوسرے قبرستان میں دفن کی گئی، جس میں امتیاز مذہب کے بغیر بچوں کو دفن کیا جاتا تھا۔

اچھوت تبلیغ کانفرنس

آل انڈیا احرار پولیٹکل کانفرنس امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوئی، جس میں خطبۂ صدارت سنانے کے بعد شاہ جی (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) نے فرمایا:

> ’’اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے۔ دوسرا ختم نبوت کا ہے۔۔۔۔ تیسرا مسئلہ جو سب سے زیادہ اہم ہے، وہ پولیٹیکل اچھوت کا ہے۔ وہ ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے۔۔۔۔ اگر ان کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اچھوت کو اپنے میں جذب نہیں کر سکتا۔ اسلام نے مذہب کے معاملے میں بھی جبر واکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے تلقین کی کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے جو مسلمان نہیں...... ہمارا فرض ہے کہ اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعہ اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہے......کوئی تلوار کارگر نہیں ہوتی، بلکہ اخلاق کی تلوار ہمیشہ کے لیے انسان کو رام کر لیتی ہے، اس لیے اچھوتوں کو اپنے ساتھ ملانے اور دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ تم اس خُلق عظیم کو اختیار کر لو جو اسلام نے ہمیں بخشا ہے‘‘۔ ۱۹؂

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجلس احرار اسلام نے دینی، تعلیمی، تبلیغی اور سیاسی کوششوں کے لیے مختلف دفاتر کھولے، مختلف کانفرنسیں کیں، تا کہ ان دفاتر سے ایک ہی کام لیا جائے اور وہ ہے قادیانیت کی بیخ کنی اور مسلمانوں کے اندر صحیح اسلامی تبلیغ۔ مجلس احرار اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہی اور احراریوں کی یہ کوشش تقسیم ہند کے بعد آج تک جاری ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد اور سید احمد شہیدؒ کے ہم درس تھے۔ وہ پنجاب کے تنہا بزرگ تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں لدھیانہ میں انگریزی سامراج کے خلاف فتویٰ دیا اور انگریزی حکم رانوں سے باقاعدہ جنگ کر کے متوازی گورنمنٹ قائم کی۔ ان کا انتقال ۱۸۶۰ء، موضع ستلانہ (اصل نام ست رانا) پٹیالہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، عزیز الرحمن جامعی، اعلیٰ پریس دہلی، ۱۹۶۱ئ، ص ۶۳۔ ۶۲

۲۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی۔ ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، اشتیاق پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۱ئ، ص ۱۳۰

۳۔ رئیس الاحرار اور ہندوستان کی جنگ آزادی، ص ۱۰۳

۴۔ کاروانِ احرار، جانباز مرزا، تجارت پرنٹرز، لاہور، ۱۹۷۵ئ، ج ۱، ص ۱۳۴

۵۔ حوالہ سابق، ج ۱، ص ۲۱۹

۶۔ درحدیث دیگراں، عزیز الرحمن جامعی، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۵ئ، ص ۱۶۸

۷۔ کاروانِ احرار، ج ۱، ص ۸۲

۸۔ مجلس احرار اسلام کی ضرورت واہمیت، محمود علی خاں کیلاش پوری، ہمدرد پریس، سہارن پور، سن غیر مذکور، ص ۹

۹۔ انڈیا ز اسٹریگل فار فریڈم: رول آف ایسوسی ایٹڈ موومنٹس، ڈاکٹر پی این چوپڑا، ج ۲، آگھم پرکاش، ۱۹۸۵ئ، ص ۸۴۳ ۱۰۔ کاروانِ احرار، ج ۱، ص ۲۷۷

۱۱۔ سب سے پہلا فتوائے تکفیر، حبیب الرحمن لدھیانوی، کتب خانہ اختری، سہارنپور، یوپی، ۱۹۹۸ئ، ص ۳۳۵

۱۲۔ حوالہ سابق، ص ۳۳۶ ۱۳۔ حوالہ سابق، ص ۳۳۴

۱۴۔ مضامین رئیس الاحرار، محمد احمد رحمانی، حبیب روڈ لدھیانہ، ۱۹۶۷ئ، ص ۱۰

۱۵۔ سب سے پہلا فتوائے تکفیر، ص ۳۰۱ ۱۶۔ کاروانِ احرار، ج ۲، ص ۲۶۹

۱۷۔ حوالہ سابق، ج ۲، ص ۳۲۹ ۱۸۔ مجلس احرار اسلام کی ضرورت واہمیت، ص ۱۶

۱۹۔ کاروانِ احرار، ج ۲، ص ۴۴۴

☆☆☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ و تلخیص

امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر محمد یوسف الشربجی

مترجم: مولانا ابوسعد اعظمی

تاویل کا شمار ان اہم ترین موضوعات میں ہوتا ہے جن میں شروع سے ہی علماء کے دو گروہ رہے ہیں۔ بعض تاویل کے حق میں ہیں اور بعض اس کے مخالف۔ تاویل کا دائرہ بہت بڑا اور شاخ در شاخ ہے۔ اس مقالہ میں امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا عبدالحمید فراہیؒ کے بیان کردہ اصول تاویل کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے اپنے مقدمۂ تفسیر کی ایک فصل 'التفسیر والتاویل' میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کے بعد کے علماء مثلاً نجم الدین الطوفیؒ، بدرالدین الزرکشیؒ اور جلال الدین سیوطیؒ وغیرہ نے تاویل کے باب میں ان کی بیان کردہ اسی تفصیل پر اعتماد کیا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'التکمیل فی اصول التاویل' میں اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔

تاویل و تفسیر کے موضوع پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، لیکن کسی شخص نے بحث و تحقیق کی روشنی میں ائمۂ تفسیر کے درمیان اس طرح کا تقابلی مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بالخصوص مذکورہ دونوں اماموں کے درمیان، جنہیں اپنے اپنے دور میں قرآن کے ترجمان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ امام اصفہانی کو علوم و فنون کی تحصیل کے بعد اہل زمانہ کے درمیان کافی شہرت و پذیرائی ملی اور تفسیر اور غریب القرآن کے موضوع پر ان کی تصانیف کو مرجع اساسی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے برعکس مولانا فراہی عرصۂ دراز تک علمی و ثقافتی حلقوں، بالخصوص عالم عرب میں غیر معروف اور گم نام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے۔ تفسیر اور علوم القرآن کے بہت سے مسائل میں اساس فراہم کرنے والے اس ہندوستانی عالم کو وہ شہرت نہیں مل سکی جس کے اصلاً وہ حق دار تھے۔ درحقیقت وہ نظریۂ نظم قرآن کے علم بردار تھے۔ اسی کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تفسیر کا نام 'نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان' رکھا۔ ان کے تعارف کے لیے ان کا صرف یہی ایک کارنامہ کافی ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کا اجمالی تعارف

امام اصفہانیؒ کا پورا نام حسین بن محمد المفضل ابوالقاسم الراغب اصفہانی ہے۔ اصفہان کی طرف نسبت کی وجہ سے اصفہانی کہلائے۔ آپ کی جائے پیدائش اور تاریخ ولادت کے سلسلے میں قدیم مراجع خاموش ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ آپ کا تعلق اصفہان سے ہے اور بغداد میں آپ نے سکونت اختیار کی۔ آپ کے علم وفضل اور حکمت ودانائی پر علماء کا اتفاق رہا ہے۔ آپ کے مسلک کے بارے میں متعدد آراء ہیں۔ بعض نے آپ کو معتزلی اور شیعہ قرار دیا تو کچھ نے آپ کو اشعری کہا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ آپ سنّی المسلک تھے۔ آپ نے وسعت مطالعہ، باریک بینی، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور وجوہ اختلاف پر عمیق نظر رکھنے اور متضاد اقوال میں تطبیق کی صلاحیت ہونے کی وجہ سے کوئی متعین مسلک اختیار نہیں کیا۔ آپ نے متعدد تصانیف کا قابل قدر ذخیرہ چھوڑا ہے، جو آپ کے وسعت علم وفضل کا بیّن ثبوت ہے۔ آپ کی چند اہم تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ المفردات فی غریب القرآن

۲۔ الذریعة الی مکارم الشریعة

۳۔ محاضرات الادباء ومحاورات الشعراء والبلغاء

۴۔ تفصیل النشأتین وتحصیل السعادتین

۵۔ جامع التفاسیر

اس کے علاوہ درج ذیل مخطوطات بھی آپ کے علمی سرمایہ کے طور پر موجود ہیں:

(۱) تحقیق البیان فی اللغة والحکمة

(۲) افانین البلاغة

(۳) رسالة منبّهة علی فوائد القرآن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) تحقیق الألفاظ المترادفة علی المعنی الواحد

(۵) کتاب الحکمة

(۶) کتاب الإیمان والکفر ا؎

امام فراہیؒ کا پورا نام عبدالحمید بن عبدالکریم فراہی ہے۔ ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء میں صوبہ اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاوں 'پھریہا' میں آپ کی ولادت ہوئی۔ قرآن کریم سے شیفتگی اور عربی زبان سے والہانہ عقیدت آپ کے خمیر میں شامل تھی۔آپ کو علامہ شبلیؒ نعمانی سے شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے۔طلب علم کے لیے لکھنو، سہارنپور اور علی گڑھ کا سفر کیا۔عربی زبان میں درک حاصل کرنے کے ساتھ کثرت سے جاہلی اشعار حفظ کیے۔اپنے زمانے کی متداول زبانیں مثلاً فارسی، انگریزی اور عبرانی میں بھی مہارت پیدا کی۔قرآن کریم میں غور وفکر کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ ۱۹۳۰ء میں اس دارفانی کو الوداع کہا۔آپ نے تصنیف وتالیف کی صورت میں گراں قدر تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، جن میں سے اکثر عربی زبان میں ہیں۔

تاویل وتفسیر پر اصفہانی وفراہی کے مباحث

امام اصفہانیؒ نے اپنی تفسیر المسمّٰی 'جامع التفاسیر' کے شروع میں ایک مختصر مقدمہ تحریر کیا ہے۔اس میں اپنا منہجِ تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس سے مقصود قرآن کریم کی تفسیر وتاویل کے ان اہم ترین نکات کی وضاحت ہے جو صحابۂ کرام، تابعین اور سلف صالحین سے منقول ہیں۔ہم اس میں سے وہ چیز پیش کریں گے جس سے اس کے اسرار ورموز واضح ہو جائیں گے اور دل کو سکون وقرار حاصل ہوگا''۔ یہ مقدمہ تیئس (۲۳) فصلوں پر مشتمل ہے۔

مولانا فراہیؒ کی کتاب 'التکمیل فی اصول التاویل' کا تعارف کراتے ہوئے مولانا بدرالدین اصلاحیؒ نے لکھا ہے کہ ''امام فراہی کی اس کتاب میں ان بنیادی اصولوں کا تذکرہ ہے جن کی مدد سے قرآن کریم کی صحیح تاویل کی جاسکتی ہے۔اس کا موضوع مفہوم پر دلالت کے لحاظ سے کلمہ اور کلام ہیں اور اس کا مقصد کلام کا فہم اور معنیٔ مراد کی ایسی تاویل ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سارے احتمالات رفع ہوجائیں۔ ہر کلام میں تاویل کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور ان کا نفع عام ہوتا ہے۔ان کا تعلق کسی بھی زبان کے معنیٰ کلام کی قسم سے ہوتا ہے، لیکن اس کا سب سے بڑا فائدہ کتاب اللہ کا فہم اور اس کے محاسن کی معرفت ہے، تاکہ اس پر مضبوطی سے قائم رہا جاسکے۔" 'التکمیل فی اصول التاویل' کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جب مولانا فراہیؒ نے دیکھا کہ فہم قرآن کے باب میں علماء میں زبردست اختلاف ہے اور اس کی تاویل میں انہوں نے مختلف مذاہب اختیار کر رکھے ہیں تو ان کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ صرف اور صرف اس وجہ سے ہے کہ تاویل کے عام اصول وضع نہیں ہوسکے ہیں، جن پر قرآن سے استنباط کرنے والا ہر شخص اعتماد کرسکے۔ اگر ان کے پاس تاویل کے عام اصول ہوتے تو ان کا اس کے باب میں اختلاف نہ ہوتا اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ ہرگز نہ کہتے۔ چنانچہ انہوں نے اس فن کی تاسیس کی شدت سے ضرورت محسوس کی اور اس باب میں سعی و جہد کے ذریعہ توفیق الٰہی سے اس فن کو راسخ اور مستحکم اصولوں پر قائم کردیا۔ اس کی بنیاد زبان اور اسالیب قرآن کے ان قواعد پر رکھی، جو راہ راست کی طرف رہ نمائی کرتے ہیں، معنیٰ مراد کے فہم میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں، تاویل میں کج روی سے بچاتے ہیں، تفسیر بالرای سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان تمام چیزوں کے لیے معیار اور کسوٹی فراہم کرتے ہیں جو قرآن سے ماخوذ ہیں"۲؎۔

مولانا فراہیؒ کی کتاب التکمیل کی حیثیت امام اصفہانی کے مقدمۂ تفسیر کی سی ہے۔ یہ ان کی تفسیر 'نظام القرآن' کا مقدمہ ہے۔ مولانا کے مطابق اس کتاب کا مقصد "ان اصولوں کی معرفت ہے جو ذہن انسانی کے مطابق فہم قرآن میں معاون و مددگار ثابت ہوسکیں۔ ان اصولوں کی دو قسمیں ہیں: (۱) وہ اصول جن سے تاویل کے باب میں کج روی سے محفوظ رہا جاسکے۔ (۲) وہ اصول جو کتاب اللہ میں شامل حکمتوں کی طرف رہ نمائی کرسکیں اور ان کا بنیادی مقصد نظم قرآن میں غور کرنا ہے۔ اس لیے کہ نظم ہی وہ مضبوط رسی ہے جس کی مدد سے کج روی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ ۳؎

مولانا فراہی کی یہ اہم تصنیف پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ اس میں آپ نے جا بجا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیاض چھوڑ رکھی ہے۔ آپ ہمیشہ فکر کو اس کا صحیح حق دینے کے خواہش مندر ہے، یہاں تک کہ جب کسی بحث کی تمام راہیں استوار ہو جاتیں تو جو کچھ آپ کے ذہن میں اس فن سے متعلق ہوتا اسے صفحۂ قرطاس پر لے آتے۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں کو جابجا بکھرے ہوئے نوادرات ملتے ہیں، جنھیں ان کے شاگردوں نے ان کی وفات کے بعد جمع کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے شاگرد نے حاشیہ میں 'افاداتِ فراہی' کے عنوان سے تاویل قرآن کے بعض اصولوں کا تذکرہ کیا ہے، جو یہ ہیں:

(۱) قرآن کریم کی آیات میں کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کی وہی تاویل کرنی چاہیے جو نظم کے خلاف نہ ہو۔

(۲) متشابہ کو محکم کی طرف لوٹانے کے سلسلے میں قرآن کی تصریحات موجود ہیں۔ پس اس سے جو چیز یقینی طور پر معلوم ہوا سے امر محکم قرار دیا جائے گا۔

(۳) ہم اپنے اصول قرآن اور عقل سے اخذ کریں گے۔

(۴) قرآن کو اس کے ظاہر سے ہٹانے کے معاملے میں ہم کسی کم زور دلیل پر اعتماد نہیں کریں گے۔ ہم ظاہر کو حجت قرار دیں گے۔

(۵) احتمالات کی صورت میں ہم نظم اور عمود کے موافق اور صحیح ترین تاویل اختیار کریں گے۔[۴]

اصول تاویل کے باب میں مولانا فراہی کی آراء کا خلاصہ یہی ہے۔ اسے آپ کے شاگرد نے سرسری طور پر افادات کی شکل میں حواشی میں جمع کر دیا ہے۔ پوری کتاب انھی اصولوں پر گردش کرتی ہے۔

دونوں کتابوں کے اجمالی تعارف کے بعد اب ان دونوں امامانِ فن میں سے ہر ایک کے نزدیک اصول تاویل کیا ہیں؟ اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

امام راغب اصفہانیؒ کے اصول تاویل

امام اصفہانیؒ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں تفسیر و تاویل کے درمیان فرق کے لیے قائم کردہ فصل میں تاویل کی دو قسمیں بیان کرنے کے بعد چند اصول تفسیر کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تاویل کی دو قسمیں ہیں: (۱) مستنکرہ (ناموزوں) (۲) منقاد (موزوں)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستنکرہ وہ تاویل ہے کہ دلیل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ناگواری کا احساس ہو اور جھوٹی تدلیسات کی وجہ سے قباحت محسوس ہونے لگے۔ اس کی چار قسمیں ہیں:

(۱) لفظ عام ہو لیکن اسے اس کے مشمولات میں سے کسی کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ مثلاً آیت کریمہ وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ (التحریم: ۴) کو بعض لوگوں نے صرف علی بن ابی طالبؓ پر محمول کیا ہے۔

(۲) دو چیزوں کے درمیان باطل کی آمیزش کر دی جائے۔ مثلاً ان لوگوں کا قول جو اس بات کے قائل ہیں کہ سارے حیوانات بھی مکلف ہیں۔ دلیل کے طور پر وہ درج ذیل آیات کریمہ پیش کرتے ہیں:

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴) وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم (الانعام: ۳۸)

(۳) جس میں کوئی جھوٹی یا جھوٹ سے ملتی جلتی خبر پیش کی جائے۔ مثلاً آیت کریمہ 'يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ' (القلم: ۴۲) میں ایک موضوع حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بعض افراد نے 'جارحہ' مراد لیا ہے۔۵

(۴) جس میں استعارات اور دور دراز کے مشتقات سے مدد چاہی جائے۔ جیسا کہ بعض افراد نے 'بقر' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے مقصود ایسا انسان ہے، جو علوم کے اسرار و رموز کھولتا ہو اور 'ہدہد' کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایسا انسان ہے جو بحث و تحقیق کے وصف سے متصف ہو۔

پہلی قسم کا نقص عموماً ان فقہاء کے یہاں نظر آتا ہے جنہیں خاص و عام کے پرکھنے کا درک نہیں ہے۔ دوسری قسم کا نقص اس متکلم کو پیش آتا ہے جو نظم کی شرائط سے اچھی واقفیت نہیں رکھتا۔ تیسری قسم کے نقص کا شکار وہ محدث ہوتا ہے جسے قبولِ احادیث کی شرائط کا صحیح فہم نہیں ہوتا۔ چوتھی قسم کا نقص اس ادیب کو پیش آتا ہے جو استعارات و اشتقاقات کی شرائط سے غافل ہوتا ہے۔

اس کے بعد امام اصفہانیؒ لکھتے ہیں کہ 'موزوں تاویل وہ ہے جس میں مندرجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالا نقائص راہ نہ پاتے ہوں، البتہ راسخین فی العلم کے درمیان اس کے سلسلے میں تین صورتوں میں اختلاف پیش آسکتا ہے:

(۱) لفظ میں اشتراک کی وجہ سے۔ مثلاً لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (الانعام: ۱۰۳) کی تاویل میں اختلاف کہ اس سے ظاہری آنکھ مراد ہے یا دل کی آنکھ؟

(۲) کسی ایسے معاملے کی بنا پر جس کا تعلق نظم سے ہو۔ مثلاً وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوا (النور: ۴-۵) میں یہ اختلاف کیا یہ استثناء صرف معطوف پر منحصر ہے یا معطوف و معطوف علیہ دونوں پر؟

(۳) مفہوم مخفی ہو اور لفظ میں اختصار ہو۔ مثلاً وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ: ۲۲۷)۔

اگر اس میں مذکور چیز کا تعلق امر یا نہی عقلی سے ہو تو اس کی توضیح کے لیے دلائل عقلیہ کا سہارا لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس پر ابھارا ہے: كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (ص: ۲۹)۔ اگر اس کا تعلق امر شرعی سے ہو تو اس کی توضیح کے لیے کسی محکم آیت یا واضح سنت کا سہارا لیا جائے گا۔ اگر اس کا تعلق اعتقاد سے ہو تو عقلی دلائل کا سہارا لیا جائے گا اور اگر اس کا تعلق عبرت پذیری کے واقعات سے ہے تو اس کے سلسلے میں قصص میں مذکور صحیح روایات کا سہارا لیا جائے گا۔ ۶

امر عقلی سے مراد وہ امر ہے جس کے حسن کا عقل تقاضا کرتی ہو اور گردش ایام سے اس میں کوئی تغیر نہ ہوتا ہو۔ خبر اعتقادی وہ خبر ہے جس میں اس چیز کا اظہار ہو جس پر یقین رکھنا ضروری ہے، مثلاً آیت کریمہ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء: ۱۳۶)۔ عبرت پذیری سے متعلق خبر سے مراد وہ خبر ہے جو اس چیز کی بابت اطلاع فراہم کرتی ہو جس میں عبرت پذیری کا سامان ہو، جیسے سابقہ انبیاء اور گذشتہ قوموں کے واقعات، خلق ارض و سماوات سے متعلق معلومات۔ امر شرعی وہ امر ہے جس کے حسن کی معرفت کا انحصار ہماری عقل پر نہیں ہے اور انسانی مفادات کے لحاظ سے ان میں نسخ اور تبدیلی پیش آتی رہتی ہے۔ نہی شرعی کے قبح کی معرفت سے بھی ہماری عقل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عاجز ہے اور ان کا فائدہ مخاطب کو اچھائیوں کے حصول اور برائیوں سے اجتناب پر آمادہ کرنا ہے۔ تخاطب کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ مخاطب تک حق و باطل کا فرق پہنچا دیا جائے، تاکہ وہ باطل کے بجائے حق کی پیروی کرے۔ امر و نہی کی ایک شکل جمیل و قبیح کے درمیان فرق بھی ہے، تاکہ وہ جمیل کا قصد کرے اور قبیح سے اجتناب کرے۔ ۷ے

امام اصفہانی کی تفسیر 'جامع التفاسیر' کا جائزہ لیتے وقت صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے دورانِ تفسیر ان تمام اصولوں کا لحاظ رکھا ہے۔ مثلاً پہلا اصول کہ اگر کوئی امر یا نہی عقلی ہو تو اس کی توضیح و تشریح میں دلائل عقلیہ کا سہارا لیا جائے گا، بیان کرنے کے بعد انھوں نے اس کو مذکورہ آیتِ کریمہ پر تطبیق دی ہے: "یَآَیُّھَا النَّاسُ کُلُوا مِمَّا فِی الأَرْضِ حَلٰلاً طَیِّباً وَ لاَ تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ إِنَّهُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ" (البقرۃ:۱۶۸)۔ انھوں نے لکھا ہے کہ 'الطیب' وہ چیز ہے جسے عقول صحیحہ پسند کرتی ہوں۔ اس کے برعکس خبیث ہے۔ حلال طیب سے عام ہے، اسی طرح حرام خبیث سے عام ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی چیز بھی حرام ہوسکتی ہے جو بالذات عقلاً خراب نہ ہو، جیسے ازلام کے ذریعہ تقسیم کردہ چیزوں کی حرمت، سونے چاندی کا استعمال، مردوں کا ریشم پہننا۔ آیتِ کریمہ میں حلال اور طیب دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد ان امور کی اطلاع ہے جنھیں انسانی مزاج پسند کرتا ہے اور شریعت نے انھیں مباح ٹھہرایا ہے۔ اور چوں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں شیطان انسان کے سامنے آراستہ کرکے پیش کرتا ہے، جب کہ حقیقت میں وہ طیب نہیں ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے طیب کے مباح ہونے کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی فرما دیا: وَ لاَ تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ إِنَّهُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ یہ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس کی عداوت صاحبِ نظر افراد سے مخفی نہیں ہے۔ ۸ے

تاویل کے سلسلے میں امام اصفہانی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ "اگر کوئی شرعی حکم ہو تو اس کی توضیح و تشریح کے لیے آیتِ محکمہ یا سنتِ مبیّنہ کا سہارا لیا جائے گا"۔ اس اصول کی روشنی میں انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے عموماً قرآن و حدیث سے بہ کثرت استدلال کیا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال ہمیں آیت کریمہ یَآَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسۡتَعِیۡنُواۡ بِالصَّبۡرِ وَالصَّلاَۃِ إِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیۡنَ (البقرۃ: ۱۵۳) کی توضیح و تشریح میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر پر ابھارا ہے، اس لیے کہ یہ ہر فعلِ خیر کا ذریعہ اور ہر قسم کے فضائل کی اساس ہے۔ اس وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "صبر کا ایمان میں وہی مقام ہے جو سر کا جسم میں ہے۔ صبر رخصت ہونے سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے" (مصنف ابن ابی شیبہ)۔ دوسری جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا، "صبر سراسر خیر ہے" اور نماز خشوع وخضوع اختیار کرنے اور فحش کو ترک کرنے پر آمادہ کرنے والی شئ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے" (العنکبوت: ۴۵)۔ لہٰذا ذکر اور شکر کا حکم دینے کے بعد وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے صبر اور نماز سے مدد چاہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صبر ایمان کی اساس اور شکر اس کی انتہا ہے۔ اس وجہ سے آپؐ نے فرمایا: "صبر نصف ایمان ہے" (بیہقی)۔ اور پھر آگے إِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیۡنَ کہہ کر یہ واضح کر دیا گیا کہ انہیں اللہ تعالی کی معیت حاصل ہے ۔جیسا کہ سورۂ طور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ فَإِنَّکَ بِأَعۡیُنِنَا"۔[9] تفسیر میں اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔[10]

امام اصفہانیؒ کا تیسرا اصولِ تاویل یہ ہے کہ اگر کسی امر کا تعلق اعتقاد سے ہو تو اس کی تاویل کے سلسلے میں عقلی دلائل کا سہارا لیا جائے گا۔ مثال کے طور پر آیت کریمہ قُلۡ أَتُحَآجُّونَنَا فِیۡ اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمۡ وَلَنَا أَعۡمَالُنَا وَلَکُمۡ أَعۡمَالُکُمۡ وَنَحۡنُ لَہُ مُخۡلِصُونَ (البقرۃ: ۱۳۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "کسی معاملے کے حق میں واضح دلیل پیش کرکے مقابلہ کرنا 'محاجۃ' کہلاتا ہے۔ آیت کریمہ وَ اَلۡزَمَھُمۡ کَلِمَۃَ التَّقۡوٰی میں مذکور دلیل کو اس آیت کے ذریعہ ان پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ چونکہ اجمالی طور پر شریعت کی اساس تین چیزوں پر ہے: خالقِ کائنات کو تسلیم کرنا، اس کے مطابق عمل کرنا اور اخلاص کا ہونا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہہ دو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اقرار اور اس کے مطابق عمل کرنے میں یکساں ہیں اور ہمارا امتیاز یہ ہے کہ ہمیں اخلاص حاصل ہے جب کہ تم اس سے محروم ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ اخلاص صرف مسلمانوں کا حصہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے؟ یہ تو محض دعویٰ ہے، تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تدبر و تفکر پر آمادہ کیا ہے، تلاش و تحقیق اور تدبر و تفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ عقائدی اصول درحقیقت وہی ہیں جنہیں اللہ تعالی نے سورہ نسائ: ۱۳۶ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ میں بیان کیا ہے۔ اگر اللہ تعالی کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کے تعلق کا جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ مسلمان ہی مخلص ہیں۔ اس لیے کہ یہود اس کی مشابہت کے قائل ہیں، جب کہ نصاریٰ تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا دعوی ہے کہ جبریل ان کے دشمن ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہود کا خیال ہے کہ وہ نبی نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک متقی شخص ہیں۔ اسی طرح انہوں نے لوطؑ پر (نعوذ باللہ) نشے کی حالت میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ بدکاری کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہیں اور انہوں نے توریت و انجیل میں مذکور بعض احکام کا انکار کیا ہے۔ بعث کے متعلق ان کا خیال ہے کہ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً (البقرۃ: ۸۰)۔ نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ انہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا، بلکہ ثواب و عقاب جو کچھ ہونا ہے، روح کے ساتھ ہوگا۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کا یہ کہنا کہ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ بالکل واضح ہے۔ ۱۱؎

امام اصفہانیؒ کا بیان کردہ آخری اصول تاویل یہ ہے کہ اگر کسی امر کا تعلق عبرت پذیری کے واقعات سے ہے تو اس سلسلے میں قصص میں بیان کردہ صحیح روایات کا اعتبار کیا جائے گا۔ یہ اصول بالکل واضح ہے اور ان کی تفسیر میں جا بجا اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً آیت کریمہ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا . . لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (البقرۃ: ۷۲۔۷۳) کی تشریح میں انھوں نے اسرائیلیات اور ضعیف اور بے بنیاد روایات میں غور و خوض نہیں کیا ہے، بلکہ ان واقعات سے متعلق صرف صحیح روایات کی طرف رجوع کیا ہے۔ مقتول کو جسم کے کس حصے سے مارا گیا؟ اس کے متعلق کسی بات پر اعتماد نہ کرتے ہوئے انہوں نے وہب بن منبہ سے منقول تمام اقوال کو نقل کر دیا ہے، پھر لکھا ہے کہ آیت کا ظاہر کسی عضو کی تخصیص کا متقاضی نہیں ہے۔

مذکورہ مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ امام اصفہانیؒ نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان کردہ اصول تاویل کی تطبیق کی کوشش کی ہے اور واضح طور پر اپنے منہج تفسیر میں اس کا التزام رکھا ہے۔

مولانا فراہیؒ کے اصولِ تاویل

مولانا فراہیؒ نے تاویل کے تین اصول بیان کیے ہیں۔ ان کو اختیار کر کے کتاب اللہ میں کج روی کا دروازہ بند کیا جا سکتا ہے: (۱) بنیادی اصول۔ (۲) ترجیحی اصول۔ (۳) باطل اصول (جن پر لوگوں نے اعتماد کیا ہے، حالاں کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ان کا تذکرہ ان سے اجتناب کے لیے کیا جائے گا)۔

بنیادی اصول: جب کلام میں مختلف معانی کا احتمال نہ ہو تو ان کو اختیار کیا جائے گا۔

ترجیحی اصول: جب کلام میں مختلف معانی کا احتمال ہو تو ان کو اختیار کیا جائے گا۔

مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں کہ ''ترجیحی اصول کی مدد سے اقرب الی الصحۃ مفہوم تک ہماری رسائی ہوسکتی ہے۔ ۱۲؎ اس کے بعد انھوں نے ان اصولوں کی تشریح فرمائی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے بنیادی اصول کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) نظم کلام اور سیاق و سباق کا لحاظ رکھنا: اس کا شمار ترجیحی اصول میں نہیں ہو گا، کیوں کہ کلام ایسے معنی کا متحمل نہیں ہوسکتا جو اس کے نظم اور سیاق کے موافق نہ ہو۔ انسانوں کا کلام نظم سے خالی نہیں ہوتا تو اللہ تعالی کا کلام کیوں کر اس سے خالی ہوسکتا ہے۔ یہ اصول بالکل واضح ہے، لیکن اہل زیغ نے اس کو پامال کر کے طرح طرح کی احادیث گھڑ لیں اور کم زور عقل مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ اس کی ایک واضح مثال آیت تطہیر ہے۔ ۱۳؎ اس کا نزول اور اس کا تعلق صرف اور صرف امہات المومنین سے ہے، اس میں دوسروں کا کوئی دخل نہیں ہے اور کلام میں اس کے عموم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) شاذ معانی کا اعتبار نہیں ہوگا: اسے ہم نے ترجیحی اصول میں شامل نہیں کیا ہے، اس لیے کہ بسا اوقات ظاہر اور عامی لفظ کے بجائے بہترین لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کا استعمال ہوتا ہے تو وہ لازمی طور پر اپنے معلوم اور ثابت شدہ مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ اگر اس سے کوئی ایسا مفہوم مراد لیا جائے جو لوگوں میں غیر معروف ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کوئی اس مفہوم کا دعویٰ کرے، حالاں کہ اس کے اثبات کی گنجائش نہ ہو تو یہ اندھا پن ہے۔ قرآن کا نزول عربی مبین میں ہوا ہے، لہٰذا وہ فصیح ،معروف اور واضح کو چھوڑ کر شاذ، منکر اور غریب لفظ استعمال نہیں کرسکتا۔ جہاں تک اعلیٰ مطالب کا تعلق ہے تو وہ اس قبیل سے نہیں ہے، کیونکہ اس میں کلام اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہوتا ہے اور مطالب عالیہ درحقیقت مفہوم کے ضمن میں شامل ہوتے ہیں، وہ مفہوم کے خلاف اور اس کے برعکس نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال إِن تَتُوبَا إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا (التحریم :۴) ہے۔ اہل باطل نے 'صغو' کو 'زیغ' کے مفہوم میں تبدیل کردیا اور اپنی باطل تاویل کے حق میں ایک باطل قراءت وضع کرلی، جو ثابت ہی نہیں، چہ جائے کہ متواتر ہو۔

(۳) کلام کی معرفت کے لیے اس کے بعض حصوں کا بعض سے تقابل اور نظائر،جس کا نام تفسیر القرآن بالقرآن ہے: قرآن کریم میں بہ کثرت کسی ایسے واقعہ کا اجمالی تذکرہ ہوتا ہے جس کی تفصیل وہ کسی دوسرے مقام پر پیش کرچکا ہوتا ہے اور اس کا مفہوم نفس کلام سے آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔اس سلسلے میں سورۂ انفال کی آخری آیات بطور مثال پیشِ خدمت ہیں۔ آیت کریمہ ہے: إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانفال:۷۲) اس کے بعد ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اس میں بأموالهم و أنفسهم محذوف ہے، جو سیاق کلام سے سمجھ میں آرہا ہے ۔اس کے بعد ہے: وَالَّذِيْنَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ (الانفال:۷۵) اس میں فی سبیل اللہ اور بأموالهم و أنفسهم کسی کا ذکر نہیں ہے، لیکن سیاق کلام سے پورا مفہوم سمجھ میں آرہا ہے اور 'معکم' کہہ کر اس کی دلیل فراہم کردی گئی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے 'التکمیل فی اصول التاویل' کے مقدمہ میں نظم اور تاویل کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''تاویل کو نظم سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا ربط ہے۔ اولاً میرا ارادہ نظم قرآن کو بیان کرنے کا تھا، جس کے لیے مجھے تاویل کی وضاحت کی ضرورت پیش آئی، پھر اس میں مجھے خیر کثیر ملا۔ کیوں کہ اس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کے اسرار و رموز کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، غلطیوں کا امکان کم ہوجاتا ہے۔نظم کے ذریعہ میں نے ایک بڑی حقیقت کی راہ پالی‘‘۔ ۱۴؎ اپنے اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ’’معنیٰ مراد کو سمجھنے کے طریقے دو ہیں: (۱) تفسیر القرآن بالقرآن۔(۲) نظم کلام کی رعایت۔اس کی توضیح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ زمانۂ قدیم سے علماء اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔قرآن کریم میں کہیں اجمال ہے تو کہیں تفصیل۔ایک جگہ جس چیز کا بیان موجود نہیں، دوسری جگہ اس کا ذکر کردیا گیا ہے۔قرآن نے متعدد مقامات پر اپنی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ اسے ایک مستحکم اصول کی حیثیت حاصل ہے۔اس کا مقصد مختلف امور پر دلالت فراہم کرنا ہے۔اس لیے کہ ایک ہی مفہوم مختلف عبارات میں مذکور ہوتا ہے۔مثلاً اوقات نماز کی طرف اشارہ مختلف آیات میں ہے۔ایک جگہ ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (غافر:۵۵) ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ۔وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ (ق:۳۹۔۴۰)۔ ایک دوسرے مقام پر ہے: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِينَ تَقُومُ۔وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ (الطور:۴۸۔۴۹)۔ ایک اور مقام پر ہے: فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ۔وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ (الروم:۱۷۔۱۸) مزید ملاحظہ ہو (طٰہٰ:۱۳۰۔اور اسرائ:۷۹)۔ ۱۵؎ آگے لکھتے ہیں کہ: ’’معانی پر دلالت کی مختلف صورتیں ہیں۔بسا اوقات آیت کسی ایک مفہوم پر دلالت کرتی ہے جس سے کسی دوسری آیت میں مذکور مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔کبھی دو آیتیں یا دو جملوں کو ملا کر کسی ایسے مفہوم پر دلالت فراہم کی جاتی ہے جس میں ہلکا سا ابہام ہوتا ہے۔لہٰذا اگر ہم دلائل کی ان صورتوں کو واضح کردیں تو اصل کا استعمال آسان ہوجائے گا‘‘۔۱۶؎

مزید فرماتے ہیں: ’’اصول تاویل کے سلسلے میں دوسری اہم چیز نظم کلام کی رعایت ہے۔کلام کے اندر کبھی لفظ میں اشتراک پایا جاتا ہے، کوئی لفظ حذف ہوتا ہے، کوئی مفہوم محذوف ہوتا ہے، کہیں وسط میں جملہ معترضہ آجاتا ہے اور کبھی اسالیب کی مختلف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صورتوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ مثلاً امر، استفہام اور عطف کے الگ الگ مفہوم میں ۔ لہٰذا کلمات اور اسلوب بیان کے تمام دلائل کو جاننے کے بعد مراد اصلی کو جاننے کے لیے غور وفکر کیا جائے گا۔ اشتراک کی صورت میں معنیٰ اصلی کی تعیین کے کچھ خاص اصول ہیں ۔ اسی طرح محذوف، مقدّر، سیاق کلام اور جملہ معترضہ کو جاننے کے بھی کچھ متعین اصول ہیں ۔ ان میں سب سے مستحکم اور سب سے جامع اصول نظم کا پہلو ہے''۔ ۱۷ے

مولانا فراہیؒ کے نزدیک تفسیر کا ایک اہم اصول نظائر ہیں، جو ایک دوسرے کی توضیح کرتے ہیں۔ وہ فہم قرآن کی اساس ہیں۔ اس میں غور وفکر کی چند صورتوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ: (۱) پہلے نظم کلام اور حسن تاویل میں غور کر کے مجمل اور مقدّر جملوں کو واضح کیا جائے گا۔ اس سے نظائر کے درمیان مطابقت خود بخود واضح ہو جائے گی اور مجمل اور مقدر کی تعیین کے لیے ایک اور دلیل بھی فراہم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ ایک جگہ جس چیز کا اجمالی تذکرہ ہے دوسرے مقام پر اس کی تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے۔

(۲) اگر دو کلاموں کے درمیان مطابقت معلوم ہے تو سابق ولاحق یعنی نظم قرآن پر غور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہر کلام کا ایک موزوں نظم ہوتا ہے اور ضروری نہیں ہے کہ دونوں مقام کا نظم یکساں ہو۔ اگرچہ اکثر نظائر میں کسی نہ کسی صورت میں مشابہت پائی جاتی ہے۔

نظائر کو ایک دوسرے پر محمول کرنے کے بھی مختلف اصول ہیں:

اگر کسی لفظ یا جملے کے اندر دو تاویلوں کا احتمال ہو (نظائر میں اکثر ایسا ہوتا ہے) تو اس سے کسی خاص تاویل کی تائید نہیں کی جائے گی، الاّ یہ کہ ایک تاویل راجح ہو۔ اگر راجح تاویل کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہوں تو کثرت نظائر اس کے راجح ہونے کی دلیل قرار پائے گی، ورنہ بہ صورت دیگر دونوں تاویلیں یکساں ہوں گی۔ اس کی مثال لفظ قرآن ہے ۔ اس کا اطلاق جمع شدہ چیز پر ہوگا یا پڑھی جانے والی شئے پر۔ دونوں کے مجموعے پر اس کے اطلاق کی تاویل درست نہیں ہے ۔ اگر اس کے نظائر جمع کیے جائیں تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر ایک میں متلو (پڑھی جانے والی شی) کا مفہوم صحیح قرار پائے گا اور بعض میں راجح ہو گا، بعض میں صرف اسی کے لیے اس کا استعمال ہوا ہوگا۔۱۸؎

اس کے بعد ترجیحی اصول کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں

کہ وجوہ و اعتبارات میں اختلاف کی صورت میں اس چیز کو اختیار کیا جائے گا جو مقام اور عمود کلام سے زیادہ موزوں ہو۔ اس لیے کہ ہر لفظ کے اطراف اور جہات ہوا کرتی ہیں اور ان کی حیثیت ان کے معانی کی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر واقعہ کے مختلف اعتبارات ہوتے ہیں۔ جس طرح لفظ مشترک کی اس کے موقع ومحل کے لحاظ سے تاویل کی جائے گی، اسی طرح الفاظ و معاملات کی بھی موقع ومحل کے لحاظ سے تاویل ضروری ہے۔ مثلاً وحدانیت کی صفت اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے باوجود قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر مختلف اسماء اور مختلف ترتیب سے آیا ہے۔ مثلا کہیں رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس ہے تو کہیں رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالک یوم الدین آیا ہے۔ کہیں الملک القدوس العزیز الحکیم ہے تو کہیں الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر ہے۔ جو شخص قرآن میں تدبر وتفکر سے کام نہیں لے گا اس کی توجہ کلمات کے موقع ومحل کی طرف مبذول نہیں ہوگی، نہ وہ لفظ کی جہت کو سمجھنے کی کوشش کر سکے گا۔ لیکن بصیرت اور دقّتِ نظر رکھنے والا شخص یقینی طور پر اس میں تدبر کرے گا، جس سے بعض نمایاں پہلو اس کے سامنے واضح ہو جائیں گے اور اس سے آگے تک اس کی رسائی ہو جائے گی۔ اگر صحیح طور پر اس اصول کی کسوٹی میسر آ گئی تو انبیاء ورسل کے اسماء کی ترتیب میں تدبر وتفکر آسان ہو جائے گا۔ ان کے درجات میں تفاوت کے باوجود تمھیں ان کے اسماء کے ذکر میں ایک خاص قسم کی ترتیب نظر آئے گی۔ اس کے موقع ومحل پر غور کرنے سے تمھیں دقیق اشارات حاصل ہوں گے اور ان کے موقع ومحل میں کوئی اشتباہ نہ ہوگا۔ اسی طرح احکام وقصص کی ترتیب میں بھی خاص اشارات نظر آئیں گے۔ خلاصہ یہ کہ کسی چیز کے اشارات و اعتبارات کو موقع ومحل سے اس طرح اخذ کیا جائے گا جس طرح لفظ مشترک کا مفہوم موقع ومحل کے لحاظ سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلسلے میں پہلا اصول یہ ہے کہ احتمالات کی صورت میں نظم فیصلہ کن ہو گا۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لفظ اگر مشترک نہیں ہے تو بھی اس کا ایک ہی مفہوم پر منحصر ہونا ضروری نہیں ہے، جیسا کہ بعض اہل رائے کا خیال ہے۔ اس لیے کہ لفظ مجاز بھی ہوتا ہے حقیقت بھی، عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی اور اس کے مفہوم کی مختلف صورتیں ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے وہ ان تمام معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ۲۱؎ دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کلام کے اندر متعدد احتمالات ہوں تو اس مفہوم کو اخذ کیا جائے گا جس کی نظیر باقی قرآن میں موجود ہو۔ قرآن سے جس مفہوم کی تائید نہ ہوتی ہو یا جس میں اختلاف ہو وہ متروک قرار پائے گا۔ مثلاً آیت کریمہ: **أَنَّ اللّٰہَ یَحُولُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ قَلۡبِہٖ وَ أَنَّہٗ إِلَیۡہِ تُحۡشَرُونَ** (الانفال: ۲۴) کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالی تم سے زیادہ تمہارے اندروں سے واقف ہے اور دوسرا مفہوم یہ کہ وہ انسان کو اس کے ارادہ کی تکمیل سے باز رکھتا ہے۔ پہلے مفہوم کی نظیر قرآن میں موجود ہے اور نظم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ نیز نظم کی تاویل اسی مفہوم کے مطابق ہو گی جو قرآن سے مشابہ ہو۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرو، اس لیے کہ وہ تمہارے مخفی رازوں سے بھی آگاہ ہے اور تمہیں اس کے پاس جمع کیا جائے گا۔ آیت کا یہ مفہوم معنی اور نظم کی مشابہت کے لحاظ سے ہے۔ دوسری تاویل کی بنیاد مشابہت لفظی پر ہے۔ قرآن کریم میں ہے: **وَحِیۡلَ بَیۡنَہُمۡ وَ بَیۡنَ مَا یَشۡتَہُوۡنَ** (سبا: ۵۴) یعنی اپنی خواہشات کی تکمیل سے انہیں روک دیا گیا۔ یہ بھی ایک اصول ہے، لیکن مذکورہ بالا اصول کے مقابلہ میں انتہائی ناقص ہے۔ کیوں کہ لفظ مشترک مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں سیاق و سباق اور صحت معنی کو پیش نظر رکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ۲۰؎ اسی طرح اس کی ایک واضح مثال آیت کریمہ: **اِنَّ اِبۡرَاهِیۡمَ کَانَ اُمَّةً** (النحل: ۲۰) میں لفظ 'امۃ' کا استعمال ہے۔ یہاں اس کا وہ عام مفہوم مراد نہیں ہے جو دوسرے مقامات پر اس سے مقصود ہے، کیوں کہ سیاق و سباق اور صحت معنی سے یہ پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہاں جو مفہوم مراد ہے، لفظ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ قرآن کریم میں دیگر مقامات پر لفظ امۃ کا استعمال تین معانی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے۔ (۱) کسی خاص مدت کے لیے (ہود: ۸) (۲) کسی مخصوص گروہ کے لیے (القصص: ۲۳) (۳) شاہ راہ، طریقۂ کار کے لیے (البقرۃ: ۲۱۳)۔ لیکن پہلے اور دوسرے اصول کو اختیار کرنے سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے اصول کے لحاظ سے لفظ 'قانتاً' اس کے بعد اس کی تفسیر کے طور پر آیا ہے۔ اس صورت میں 'امۃ' کا مفہوم خود سپردگی اور مکمل اطاعت ہوگا اور یہ قانت کے لحاظ سے موزوں بھی ہے۔ دوسرے اصول کے لحاظ سے اس بات کے مختلف نظائر قرآن میں موجود ہیں کہ آپؑ کی صفات میں ایک اہم صفت اطاعتِ کاملہ کی بھی ہے۔ البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لفظ 'امۃ' فرماں بردار کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ جمہور اہل لغت کی نگاہوں سے لفظ 'امۃ' کا یہ مفہوم مخفی رہ گیا، اگرچہ انھوں نے اس سے ملتا جلتا مفہوم بیان کیا ہے۔

ترجیحی اصول کی مولانا فراہیؒ نے چند قسمیں بیان کی ہیں: (الف) اگر مفہوم کسی ایسی عبارت کا متقاضی ہے جو کلام میں مذکور نہیں ہے تو وہ معنی مرجوح قرار پائے گا۔ اس کی واضح مثال تغنّی بالقرآن کے مفہوم کی تشریح میں امام شافعیؒ اور سیدہ عائشہؓ کا بیان کردہ استدلال ہے۔ (ب) عربیت کے لحاظ سے جو مفہوم زیادہ نمایاں ہو اسے اختیار کیا جائے گا۔ اس کی مثال آیت کریمہ: 'نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی' میں 'شوی' کا مفہوم ہے۔ کلام عرب میں عموماً یہ پنڈلی کے گوشت کے لیے مستعمل ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے آیت کریمہ: 'نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی' کے ترجمہ میں سہو ہوا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس سے مراد جگر ہے، حالاں کہ سیاق عذاب کے قریب ہونے کا ہے، نہ کہ منکرین کے آگ میں دخول کا۔ اس لیے کہ آیت کریمہ اس جائے قیام کی توضیح وتشریح کے سلسلے میں وارد ہے جس روز کہ جنت اہل تقوی سے قریب کر دی جائے گی اور جہنم گم راہوں کے سامنے بالکل نمایاں کر دی جائے گی۔ اس وقت جہنم کفار کو پکارے گی، اس کے شعلے اٹھیں گے اور ان کی پنڈلی کے گوشت کو جلا کر ختم کر دیں گے۔ آگ کے ان کفار کا جگر نکال لینے کا مفہوم قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب کفار جہنم میں داخل ہو جائیں گے اس وقت بھی وہ ان کے جگر اور دل کو نہیں نکالے گی۔ جن مفسرین نے 'شوی' کے معنی 'سر کی کھال' لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، ان پر نقد کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں: ''پنڈلی کے گوشت کے لیے لفظ 'شوی' کا استعمال عام ہے، سر کی کھال کے لیے کہیں کہیں لفظ 'شواۃ' کا استعمال ہوا ہے، اگر چہ اس میں دیگر معانی کے احتمالات بھی ہیں۔ قرآن و حدیث میں کہیں بھی جائے وقوع پر اوپر سے آگ کی آمد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ جب وہ ان سے قریب ہوگی تو ان کے سر کی کھال کو کھینچ لے گی۔ اگر لفظ 'شوی' کے دونوں مفہوم یکساں درجہ کے مان بھی لیے جائیں تو اس مفہوم کو اخذ کرنا، جو نظم کلام اور باقی قرآن کے موافق ہے، زیادہ موزوں ہوگا۔ لہٰذا سر کی کھال کیسے مراد لی جاسکتی ہے، جب کہ معنی غیر معروف اور مبہم ہے'' ۔۲۱؎

امام فراہیؒ کے بیان کردہ اصول (اگر کسی کلام کے اندر مختلف وجوہ ہوں تو سب سے راجح مفہوم کو اختیار کیا جائے گا) کا تقاضا ہے کہ شاذ اور منکر کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ سب سے راجح مفہوم اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کلام عرب اور بقیہ قرآن سے بھی اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہو۔ تکلّفاً ایسا نہیں کیا جائے گا۔ مولانا نے بطور مثال آیت کریمہ: لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ إِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنفُسِہِمْ (آل عمران: ۱۶۴) کو پیش کیا ہے۔ اس کی ایک قراءت (أنفسھم ف پر فتحہ کے ساتھ) ہے۔ اس تاویل کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ یہ شاذ مفہوم پر مشتمل ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر رسول کے اپنی ہی قوم کے ایک فرد ہونے کی شہادت دی ہے اور یہ بالکل واضح ہے۔ نبی کا اپنی قوم کے ایک فرد ہونے میں کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ کلام عرب میں اس طرح کی کوئی مثال بھی نہیں ملتی۔ عرب عام طور پر اپنی گفتگو میں 'ھو من خیارھم وعلیائھم' (وہ اپنی قوم کا سب سے برگزیدہ اور سربلند شخص ہے) کا استعمال کرتے ہیں۔ نیز اگر کسی قوم کے اندر ہی سے کوئی نذیر و بشیر کھڑا کیا جائے تو اس قوم پر اللہ کا فضل بھی زیادہ ہوگا۔ خود حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں بھی انہی میں سے ایک رسول کی بعثت کا ذکر ہے ۔۲۲؎

آخر میں مولانا فراہی نے چوتھا اصول (جو سراسر باطل ہے) بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا حدیث کی تاویل قرآن سے یا قرآن کی تاویل حدیث سے کی جائے گی؟ پہلے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر کر چکے ہیں کہ اس اصول کا ذکر محض اجتناب کے لیے کیا جائے گا۔اس سلسلے میں ان کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''ہدایت اصلاً قرآن کریم سے اخذ کی جائے گی اور اسی پر دین کی بنیاد استوار ہوگی، پھر احادیث پر غور کیا جائے گا۔اگر حدیث میں کوئی ایسی بات نظر آئے جو بہ ظاہر قرآن سے متصادم ہو تو قرآن مجید کی روشنی میں اس پر غور کیا جائے گا۔ اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی راہ نکل آئے تو ٹھیک ہے، ورنہ حدیث کے باب میں توقف سے کام لیا جائے گا اور قرآن پر عمل کیا جائے گا۔ ۲۳ ؎

مولانا فراہیؒ کے بیان کردہ اصول تاویل یہی ہیں۔کیا وہ اپنی تفسیر 'نظام القرآن' میں عملی طور پر ان اصولوں کی تطبیق کر سکے ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ان کی تفسیر کا عمومی جائزہ لے کر قاری آسانی سے اس کے متعلق فیصلہ کر سکتا ہے۔

امام اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصولِ تاویل کا موازنہ

امام اصفہانیؒ اور مولانا فراہیؒ کے اصول تاویل میں زمانی بُعد کے باوجود ہمیں کوئی جوہری اور بنیادی قسم کا اختلاف نظر نہیں آتا۔

(۱) دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تاویل میں نظم کلام اور سیاق وسباق کا لحاظ ضروری ہے۔امام اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ ''مستکرہ (ناموزوں) تاویل کی وہ قسم ہے کہ جب اسے تاویل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ناگواری کا احساس ہو اور جھوٹی آمیزشوں سے اس میں قباحت پیدا ہو جائے''۔مولانا فراہیؒ اس اصول تاویل میں امام اصفہانیؒ سے پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں، لیکن اسے انھوں نے دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''جب لفظ خاص ہو اور اس کی تخصیص پر کوئی دلیل موجود ہو تو اس کو عام قرار دینا درست نہیں''۔اسی وجہ سے دونوں نے الگ الگ مثالیں پیش کی ہیں۔

(۲) دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ شاذ مفہوم نا قابل التفات ہوگا۔سورۂ انعام: ۳۸ اور سورۂ فاطر: ۲۴ کو خلط ملط کر کے بعض افراد نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ حیوانات بھی مکلف ہیں۔مولانا فراہیؒ نے ترجیحی اصول میں پُر زور انداز میں کہا ہے کہ شاذ لفظ متروک قرار پائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۳) دونوں کا ضعیف احادیث کے قابل اعتماد نہ ہونے پر اتفاق ہے۔ امام اصفہانیؒ کے یہاں جھوٹی اور بے بنیاد روایت کی بنیاد پر کی گئی ہر تفسیر ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح کی روایات کا رواج عموماً ان لوگوں کے یہاں بہ کثرت ہے جنھیں علم حدیث کی صحیح واقفیت نہیں ہے۔ مولانا فراہی نے بھی اسے ایک ناقابل اعتماد اصول قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''قرآن کو اس کے ظاہری مفہوم سے پھیرنے کے لیے کسی کم زور دلیل پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک ظاہر کو ہی اصل اور حجت کی حیثیت حاصل ہوگی''۔

(۴) دونوں کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ معنیٔ مراد کو سمجھنے کا سب سے قابل اعتماد اور باوثوق ذریعہ تفسیر القرآن بالقرآن اور نظم کلام کی رعایت ہے۔

اگر ہم دونوں کے درمیان نقطۂ اختلاف کی بات کریں تو اس کی حیثیت جزوی ہے، جو تقسیم و تطبیق کے لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ تقسیم کے اعتبار سے امام اصفہانیؒ کے یہاں اصول تاویل کی دو قسمیں ہیں: (۱) مستنکرہ (ناموزوں) (۲) منقاد (موزوں)۔ مولانا فراہیؒ نے اسے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے: (۱) بنیادی اصول۔ (۲) ترجیحی اصول۔ (۳) باطل اصول۔ تطبیق کے لحاظ سے جائزہ لیں تو امام اصفہانیؒ کے یہاں فروق لغویہ اور وجوہ و نظائر کا اہتمام کچھ زیادہ نظر آتا ہے، جب کہ مولانا فراہیؒ نے ساری توجہ نظم قرآن پر مرکوز کی ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ امام اصفہانی کی مفصل سوانح جاننے کے لیے دیکھیے: البلغۃ فی تاریخ أئمۃ اللغۃ للفیروزآبادی، ص ۶۹، تاریخ حکماء الاسلام للبیھقی ظھیر الدین، ص ۱۱۲، بغیۃ الوعاۃ للسیوطی: ۲/۲۹۷، روضات الجنات للخوانساری ص ۲۴۹، الاعلام للزرکلی: ۲/۲۷۹، معجم المؤلفین لعمر رضا کحالۃ: ۴/۵۹، کنوز الاجداد لمحمد کرد علی، ص ۲۶۸۔

۲۔ رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر، اعظم گڑھ، ص ۲۰۷

۳۔ رسائل الامام الفراہی ص ۲۲۳

۴۔ رسائل الامام الفراہی، ص ۲۲۵، (حاشیہ)

۵۔ محقق کتاب ڈاکٹر احمد حسن فرحات نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ غالباً موضوع حدیث سے امام اصفہانی کی

© rasailojaraid.com